ڈاکٹر محمد یوسف لون

غنی و صائب کا ایک تقابلی مطالعہ

میرزا محمد علی صائب تبریزی[1] کسی شک کے بغیر بڑے بڑے عالموں، فاضلوں، شاعروں اور عارفوں میں سے ایک چیدہ اور برجستہ شخصیت تھے۔ اس کا منظوم اور منثور کلام بڑے بڑے استادوں نے زیر بحث لایا ہے جن میں استاد محترم آقای امیری فیروز کوہی، علی اکبر دھخدا، دکتر ذبیح اللہ صفا، پروفیسر ای۔ جی۔ براون اور مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح آیندہ بھی ان کے ادبی کارناموں پر سیر حاصل بحث جاری رہے گا۔ مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب سرو آزاد میں بعنوان "میرزا محمد علی تبریزی اصفہانی" لکھا ہے کہ صائب تبریزی غزل کے امام ہیں جیسے ان کے الفاظ اس طرح ہیں۔ "امام غزل طرازان و علامہ سخن پردازان است۔ ازاں صبحے کہ آفتاب سخن در عالم شہود پرتو افشاندہ۔ معنی آفرینی باین اقتدار سپہر دوار بہم نرساندہ۔ چنانچہ خود گوے

---

[1] میرزا محمد علی صائب ابن میرزا عبدالرحیم جو اصل میں تبریز کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ہجرت کرکے اصفہان چلے گئے تھے اور یہیں ۱۰۱۰ھ میں صائب پیدا ہوئے۔ ابتدائی جوانی میں ہندوستان کا رخ کیا۔ اور وہاں چھ سال تک مقیم رہے اس کے بعد پھر وہ ایران واپس چلے گئے۔ صفویہ سلطانوں کی خدمت میں اپنی باقی عمر بسر کی۔ انہوں نے ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی اور اصفہان میں مدفون ہیں۔ مزار کی پتھر پر یہ شعر درج ہے ؎

عندلیب نغمہ پرداز فصاحت صائبا
رفت ازیں عالم بسوی روضۂ دارالسلام

دعوی درمیدان ی انداز د می طراز دست

زصد هزار سخنور که در جهان آید

یکی چو صائب شوریده حال برخیزد[1]

صائب نے ایک خاص سبک کی پیروی کرتے ہوئے متاخرین پر بہت اثر ڈالا۔ وہ استادان فن میں شمار کیا جاتا ہے۔ صائب بہت بیدار مغز اور پرگو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صائب نوجوانی میں بہت مایوس ہو چکا تھا۔ اور ایک دفعہ اصفہان میں دریائے زندہ رود کے اوپر سی وسہ نام کے پل سے چلانگ مار کر ڈوبنا چاہتا تھا۔ عین اسی وقت اس سے الہام ہوا کہ وہ صاحب سخن بنے گا اور ہمیشہ کے لیے طالبان سخن کی مجلسوں میں یاد کیا جاتا رہے گا۔ چنانچہ اسی وقت زبان کھلی تو سوز و گداز سے لبریز اس مطلع کی غزل کہی

در ہیچ پردہ نیست کہ نیاشد نوای تو

عالم پراست از تو وخالیست جای تو

بعض لوگ متاخرین کے طرز کو "سبک هندی" کا نام دیتے ہیں جو زیادہ شایاں نہیں ہے۔ اس دور کے یہ تمام رجحانات هندی فارسی میں ایرانی فارسی ہی کی وساطت سے آئے۔ اس سبک کے اولین پیشرو بابا فغانی، شوکت بخارائی، صائب تبریزی اور عرفی شیرازی مانے جاتے ہیں۔ یہ بات روشن ہے کہ ہر ایک اسلوب کے ابتدائی نقوش ایرانی شعرا کے یہاں ملیں گے۔

اصل میں ایران میں صفویوں کا دور اور ہندوستان میں مغل بادشاہوں کا عہد فارسی زبان کی وسعت اور گسترش کا دور رہا ہے۔ اس عہد میں شعر و ادب قایم موضوعات میں

1۔ صائب کی طرح کوئی پرکیف اور پرجوش والا شاعر دنیا کے لاکھوں شاعروں میں سے بھی نہیں ملتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ صائب کا مقام بہت ہی بلند اور افضل تھا۔ سالوں سال کے انتظار کے بعد پھلواڑی کے اندر ایک ایسا پھول کھلتا ہے جس کی مہک بھری خوشبو ہر جانب سے ہر ایک کو معطر کرتی ہے۔

مقید نہ رہ کر آزاد فضاؤں کی طرف پرواز کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں اول یہ کہ جہانگیر کے عہد کے خاتمے کے نزدیک پہنچتے پہنچتے مذہب میں جذب پسندی اتحاد ادیان کی مساعی میں افراط اور فلسفیانہ آزاد روی کے خلاف ایک نیا جوش پیدا ہوا جس نے شاہجہان کے عہد میں قوت اختیار کرنا شروع کیا اورنگ زیب کے زمانے میں ہمہ گیر نتائج پیدا کیے۔ اس دور میں علما اور فقہا کو ایک بار پھر عروج نصیب ہوا۔ بادشاہ کے دربار میں عالمانہ اور فقیہانہ ماحول زیادہ پسندیدہ قرار پایا اور عیش کوشی کے خلاف آواز بلند ہوئی۔ ادھر ایران میں بھی مذہبی علما اور فقیہا کو توقیر کی نظر سے دیکھنے لگے۔ شاہ رخ میرزا کے دور میں اسکا برملا اظہار ہوا۔ ملک الشعرا بہار لکھتے ہیں:

"از این راہ است کہ ادبیات آن عصر خالی از صراحت ها و شجاعت های ادبی است و روح حقیقی شعر کہ درخشیدن معنی و حقیقت از الفاظ باشد در ہیچیک از آثار آن عصر پیدا نمی شود۔

نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ چاہیے ایران ہو یا ہندوستان کہیں بھی شعرا نہ تو صاف طور سے اپنے دور کے سیاسی اور اجتماعی حالات کی نشاندھی کر پاتے تھے۔ جب کسی بات کو اظہار کرنے پر پابندی ہو تو لفظی اور معنوی صناعیوں پر توجہ کا مبذول ہونا ناگزیر تھا۔

دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ اس دور کے بہت سے شعرا خود بھی دیندار تھے اور چند ایسے بھی تھے جو نہایت ہی زاہدانہ اور عارفانہ زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ صائب اور غنی دونوں ہی کا اس طبقے سے تعلق ہے۔ انہوں نے ہر جانب سے اخلاقی پستی اور مذہب سے لاتعلقی پائی وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ مذہب اور اخلاقیات کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اخلاقیات کے مضمون میں تازگی پیدا کرنے کے لیے تمثیل کا سہارا یقیناً خوش آیندہ بات تھی۔ یہ شعرا کسی عظیم سماجی نظام کی عمارت کی بربادی دیکھ کر اس کو سنبھالنے کے لیے دوڑتے تھے۔

تیسرا اور اہم ترین سبب اس عہد کی بڑھتی ہوئی علمیت بھی تھی۔ مدرسوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں بلکہ بعض دیہاتوں میں بھی علمی اور ثقافتی کاوشوں کے آثار

نظر آنے لگے تھے۔

عربی و فارسی کے متداول علوم کے علاوہ اکبر اور جہانگیر کی سرپرستی میں سنسکرت زبان کے کتابوں کے تراجم ہوئے۔ ان سے نئے علوم و اسالیب کی طرف توجہ ہوئی۔ شاہجہان کے دور میں زیادہ سکون اور اس کے آثار نظر آئے اور کشادہ راہ عمل نمودار ہوئی۔ اس دور میں تفسیر، تشریح، تالیف اور تاریخ نویسی کا کام سامنے آیا۔

سخن تازہ، شیوہ تازہ، طرز تازہ، اختراع سخن، یعنی نئی بات، نیا مضمون، نیا طرز بیان، نئی تمثیل، پرانے مضمون کے باندھنے کا نیا شیوہ، نیا خیال یا پرانے خیال کا نیا طرز یہ اس دور کی شاعری کے نئے محور تھے۔ اس نیا طرز کلیم، سلیم، قدسی، صائب، غنی، احسن اور آشنا جیسے شعرا ہی پیدا کر سکتا تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اس دور کا عام نظریہ خیال آفرینی، معنی آفرینی، تمثیل بیانی، ابہام اور دوسرے صنعتیں اس زمانے میں شاعری کا طرّہ امتیاز ہیں۔

غنی نے ان سب کو برتا وہ اگرچہ صائب کے شاگرد نہ تھے لیکن ان پر صائب کی بہت گہری چھاپ رہی ہے اور یہ اگران کے اپنے اُستاد فانی کے اثر سے زیادہ نمایاں ہے۔ صائب کی شاعری جو خوب ڈھنگ سے ان الفاظوں سے مزین کی ہے جن میں متانت، نزاکت، رنگینی، روشنی، قوانی اور سجع کی رعایت رکھی ہوئی ہے۔ ان خصوصیتوں میں ہر ایک پر ایک بحث درکار ہے۔ اس کے بیانات کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہنر اس کے سامنے عبارت ہے۔ بیان کی زیبائی سے جو مختلف صنایع و بدایع کے حسن امتزاج سے وجود میں آتے ہیں اور فکر کی توانامندی سے وہ لذت زیادہ ہی لطف اندوز ہے۔ صحیح طرز ادا میں صائب نے شعر مرصع و رنگین کو چاہیئے ہندستان یا ایران میں بلندی تک پہنچایا تھا اور کامل استاد کے نام سے معروف ہوا۔ چنانچہ استاد امیری فیروز کوہی نے لکھا ہے۔ "شعر صائب را با نشر اردپائی کر حقا از حیث توصیف احوال و تجسم حقایق حیات و سایر نکات مشہور در حد اعلای کمال میباشد شاہی عجیب و متفاوانہ ای کامل درکار است و از ھمین نظر اشعار او در طبع ذوق خارجیان کر با ترجمہ بزبان خود و با آشنائی بزبان فارسی چیزی از آثار اورا دیدہ اند تاثیر و کیفیت

بخصوص دارد که پروفیسور براون متوفی مستشرق دانشمند اشاره ای اجمالی بدان کرده ومینویسد کردنی ابیاتی منتخب از گویندگان را باستماع از دیگران جمع میکردم و چون درصدد تحقیق صاحبان آنها برآمدم دانستم که اکثر آن ابیات از صائب است"۔ (مقدمہ ص ۱۶)

حزین لاہیجی[1] اس دور کے شعرا اور علما کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"بر مشاعر فہم وافقان مشعر توفیق، و قرائح صافیہ و جرع نوشان زمزم تحقیق. نهفته نیست که ناسکان مناسک تقوی و سالکان مسالک نشئہ عقبی را اقدام بہ مراسم وظایف واجبہ ومندوبہ، وتخلق بہ اخلاق حمیدہ ومطلوبہ، در طی ہر حالی از احوال و در خلال ہر فعلی از افعال مطمح نظر ونصب العین است حتی آنکه جمعی که بہ کحل الجواہر توفیق سرمدی دیدہ بصیرت ایشان مکحل است، تمتع از ضروریات سنہ بشری والتذاذ بہ مشتہیات بدن عنصری بہ نحوی ارتکاب می نمایند که بہ دستیاری نیل ہر لذتی ومطلوبی، برقع از جمال تحصیل واجبی یا مندوبی می گشایند"

اس تناظر میں صائب کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

در بہار ما خزان ہا چون حنا پوشیدہ است
گرچہ در ظاہر بہاری بی خزان داریم ما
قطرہ شد سیلاب و واصل شد بہ بحر از اجتماع
تا بہ کی باشند این بیحاصلان از ہم جدا

۱۔ مجمع الفصحا اور تحفۃ العالم کے حوالے سے ان کا پورا نام علی بن ابو طالب ہے اور تخلص "حزین" تھا۔ اپنے قول کے مطابق وہ سوموار ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۰۳ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے تھے۔ غزل میں ایک دیوان ہے۔ چمن و انجمن، خرابات، صفیر دل، تذکرۃ العاشقین اور ودیعۃ البدیعہ یا بدیعہ الودیعہ اس کی پانچ مثنویاں ہیں اور نثر میں رقعات حزین، رجم الشیاطین، تذکرۃ الاحوال اور تذکرۃ المعاصرین موجود ہیں۔

آدمی پیر چو شد حرص جوان میگردد ؎۱
خواب در وقت سحرگاه گران می گردد
کریم اوست کہ خود را بخیل میداند
عزیز اوست کہ خود را ذلیل میداند

جب ہم صائب اور غنی کے کلام کو ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو کوئی واضح فرق دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ دراصل دونوں کا موضوع ایک ہی ہے اور دونوں کا اثر یکساں ہے۔

ملا محمد طاہر غنی کشمیری ؎۲ ایک عارف شاعر ہونے کے علاوہ پاکیزہ دل اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ فن شاعری میں ان کی طبیعت نہایت موزوں تھی۔ وہ اپنے لطیف احساس کو شعر کی زبان بخشتے تھے، جو خوش آہنگ لفظوں اور کلموں کے ساتھ جڑے رہتے تھے اور اپنے اثر میں دل نشین اور لایق ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار دل موہ لینے والے اور مٹھاس بخشنے والے ہیں۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

در این گلشن نباشد طوطی شیرین سخن چون من

؎۱:- جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی لالچ جوان ہو جاتی ہے۔ نیند صبح کے وقت زیادہ گراں ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی لالچ میں زیادہ ہی اضافہ ہوتا ہے۔ صبح کے وقت آدمی نیند کو زیادہ پسند کرتا ہے اور اس سے دل لگاتا ہے۔

؎۲:- مختلف تذکروں کے حوالے سے جن میں "تذکرہ نصرآبادی" مولف محمد طاہر نصرآبادی "تذکرہ کلمات الشعرا" تالیف محمد افضل سرخوش ھندا اور دیگر تذکروں کے مطابق شاعر کا نام محمد طاہر اور تخلص غنی ہے۔ کچھ تذکروں میں اس کا لقب ملا یا مولانا درج ہے۔ صرف احمد علی خان ھاشمی مولف مخزن الغرائب نے ان کا نام شیخ محمد طاہر غنی کشمیری لکھا ہے۔ تذکرہ نویسوں کے مطابق غنی ۱۶۳۰ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ معاصر تذکرہ نویسوں کے مطابق غنی نے ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی۔

بر کار نیشکر صد عقدہ افگندست منقارم

شعر و شاعری کے ساتھ وہ گہری دل چسپی رکھتے تھے ؎

ھر چند شد لبم چو لب جوز شعر تر
ھستم ھنوز تشنۂ اشعار آب دار

اسی طرح غنی کو اشعار بہت پسند تھے اور ان کی زیادہ توصیف بخشتے تھے ؎

شد زمین شعرم از گل ھای مضمون گلشنی
ھست ھر بیتی درو عشرت سرای عندلیب

جس وقت اس کے با معنی اور بامراد اشعار کی شہرت دنیا بھر میں پھیلی۔ ان کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لے لیتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ ان کے احباب نے اپنے اشعار کے دیوان پانی میں پھینک دیئے۔ اس بارے میں خود کہتے ہیں ؎

اشعار آب دارم تا شد محیط عالم
انداختند در آب یاران سفینہ ھا را

غنی نے نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ بعد میں آنے والے صاحبان نظر کو بہت متاثر کیا تھا مثلاً میرزا محمد طاہر نصر آبادی اصفہانی نے غنی کی لطافت شعری کا اقرار ان لفظوں میں کیا "حقا کہ درست سلیقہ و غریب خیال بود" اشعارش ہمگی لطیف است۔ والہ داغستانی نے غنی کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

غرضیکہ درستی زبان و روانی الفاظ و لطافت معانی او مقبول ہمہ بود والحق از کشمیر مثل او کسی بر نخاستہ۔

شیر علی خان لودھی نے "مراۃ الخیال" میں نہ صرف غنی کی شاعری پر رای دی ہے بلکہ ان کی عالمگیر مقبولیت کا بھی ذکر کیا ہے۔

" اشعارش مانند گلھای کشمیر ہموارہ با طراوت معنی و طرز کلامش چون غنی' کلام خوبان پیوستہ با حلاوت' واردات او را معنی خاص بسیار است و مضامین تازہ بے قیاس.....آنچہ

از طبع وقادش سر زدہ بود امروز در ایران و توران و سواد ھندوستان بر افواہ والسنہ جاری است۔

غنیؔ کی علمیت، وسعت مطالعہ، ذہانت وغیرہ صائبؔ وسلیمؔ وکلیمؔ و قدسیؔ اور فانیؔ جیسے صاحبانِ نظر کی صحبت سے سرشت تھی۔ ان سب چیزوں نے مل کر غنیؔ کو اس حلقۂ خاص کا شاعر بنا دیا جس کی نظر ہر وقت نئے اور تازہ مضامین پر مرکوز رہنے لگی۔ ؎

ہر دم از گوشۂ خاطر سر جستن دارد
معنیٔ تازہ غزالیست کہ بستن دارد

شاعری محسوسات اور مشاہدات کے عمیق تجزیہ میں اور تمثیل گوئی کے انداز میں غنیؔ کا کلام بے مثال ہے تمثیل گوئی کا آغاز امیر خسرو نے کیا اور میرزا صائبؔ نے اس سے عروج کمال پر پہنچایا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے لیکن غنیؔ میں بھی کوئی کمی باقی نہیں ہے۔ اس نے مثالیہ شاعری کو اتنی ترقی بخشی کہ اس سے ایک دائمی فن بنا دیا اور ایک عرصہ تک غنیؔ کی پیروی کو ھندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی لائق سمجھا جاتا رہا۔ اس کا ثبوت ان ہی کے ایک شعر سے یوں ہوتا ہے ؎

چنان تمثیل را دادہ رواجی
کہ از فکر غنیؔ گیرد رواجی

غنیؔ نے دعویٰ و دلیل کے لیے زیادہ تر پیش پا افتادہ علامات ہی سے کام لیا ہے۔ ذیل کی چند علامتیں پیش کی جاتی ہیں:

جام - جنون - صحرا - دشت - قفل - کلید - زلف - شانہ - میخانہ - ابر بہار - ساغر - ساقی - بلبل اور آشیانہ وغیرہ۔

ایہام اور تمثیل کے علاوہ غنیؔ کے یہاں لفظی اور معنوی صنعتیں بے شمار ہیں مثلاً حسن تضاد، طباق، مراعاۃ النظیر، تجنیس اور لف ونشر وغیرہ کا استعمال جا بجا ہے۔[۵۹]

[۱] ۔ لف ونشر۔ پراگندہ کا لپٹنا۔ مراعاۃ النظیر۔ رعایت کرنا ان لفظوں کا جو آپس میں مناسبت رکھتے ہیں جیسے گل وخار وبلبل طباق۔ دو چیزوں کا آپس میں موافقت کرنا تجنیس۔ ہم جنس ہونا۔ یکساں ہونا۔

سماجی روح کی بیداری بھی ایک اچھے انداز سے چاہتے تھے تاکہ لوگوں کے خاطر میں ایک انقلاب کی کیفیت پیدا ہو جائے اور یوں محسوس کرتے لگتے ہیں ؎

انقلابی بغم آباد جہاں آباد می تواهم
شاید این طالع برگشتہ من برگردد

جو بھی شعر غنیؔ کی زبان سے نکلتا تھا وہ فوراً زبان زد عام ہوتا تھا۔ اسی طرح جس طرح نوزاد بچے کے پاؤں مضبوط ہوتے ہیں تو وہ دوڑنے لگتا ہے ؎

بود گویا طفل نو رفتار شعر تازہ ام
کز لبم تا رفت بیرون بر زبان ها افتاد

غنیؔ کے اکثر اشعار تمام طور بے عیب اور بے خلل ہیں ؎

بسکہ پستی و بلندی شد ز شعرم برطرف
می شود هر مصرعم با مصرع دیگر طرف

الغرض غنیؔ کے اشعار میں نافہ کی خوشبو موجود ہے یہاں تک دوران حیات میں ہی ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ اس کی مقبولیت ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں مثلاً ایران افغانستان اور وسط ایشیا وغیرہ میں پھیلی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

"غنیؔ" تا ز نفس چون رشتہ گلدستہ می گردد
زبانم گر بہ تقریر آورد اشعار رنگین را

اس طرح سے دونوں کی باہم یکسانیت اور موزونیت ہر لحاظ سے نہ صرف احساس کی تازگی میں دکھائی دیتی ہے بلکہ دونوں کی گہرائی اور گیرائی میں ایک خاص انداز ہے جو کسی بھی صورت میں ایک دوسرے سے علاحدہ نظر نہیں آتا ہے۔ لہٰذا ان کی تعلیمات سے ہمہ جہت نتائج برآمد ہونا ایک فطری بات ہے۔ جو الفاظوں کے سانچے میں ڈال کر ایک عجیب و غریب کیفیت سے نہ صرف ہمکنار ہیں بلکہ وابستہ بھی ہیں اور زبان و ادبیات کے نئے نکھار کو زینت سے آراستہ و پیراستہ کیا۔